پروفیسر نثار احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی)

خانقاہی نظام کی اہمیت

خانقاہی نظام پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ''خانقاہ'' کیا ہے؟ اس کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، مگر اُن کی تصدیق لغت اور اصولِ اشتقاق سے نہیں ہوتی۔ اتنا یقینی ہے کہ یہ لفظ مفرد نہیں مرکب ہے۔ ''خان'' منگولوں کی زبان میں بادشاہ کو کہتے ہیں۔ جب ہم ہلاکو خان یا چنگیز خان کہتے ہے تو اس سے اُن کا پٹھان ہونا مراد نہیں ہوتا، بلکہ چنگیز خان کہنا ایسا ہی ہے جیسے ہم کنگ ایڈورڈ کہیں یا ٹیپو سلطان کہیں۔ اب رہا دوسرا جز ''قاہ'' تو یہ فارسی لفظ ''گاہ'' کا عربی تلفظ ہے۔ قاف اور گ کی آوازیں متبادل ہیں، مصری لہجے میں آج بھی اقول لک کو اگول لک بولتے ہیں۔ اِسی طرح قول کو پنجابی زبان میں ''گل'' بنالیا گیا ہے۔ تو گاہ بھی قاہ ہوگیا۔ گاہ وہی ہے جو درس گاہ، چراگاہ وغیرہ میں اسمِ ظرف مکان اور صبح گاہ و ناگاہ وغیرہ میں ظرف زمان کے لیے آیا ہے۔ خانقاہ کا مفہوم آقا یا مالک یا روحانی بادشاہ یعنی مرشد کا گھر---سکھ دھرم کی اصطلاح میں گردوارہ۔ اس لفظ کی ترکیب بتا رہی ہے کہ اس کا رواج وسط ایشیاء کے علاقے سے شروع ہوا ہوگا۔ ابتدائی صدیوں میں عرب علاقوں میں یا علماء وصوفیہ کی تصانیف میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ اگرچہ بعد کے دَور میں خانگاہ کرلیا گیا۔

عرب دُنیا میں صوفیہ کے محلِ سکونت کو عموماً ''زاویہ'' کہا جاتا ہے۔ زوایا اس کی جمع ہے۔ اس کا لفظی مفہوم وہی ہے جو انگریزی لفظ Seclusion کا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضراتِ صوفیہ کی گوشہ نشینی، اعتزالِ خلق اور حاکمانِ وقت سے بے تعلقی، تنہائی، ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت اِن سب کا پرتو لفظ زاویہ میں موجود ہے۔

دوسرا لفظ جو درویشوں کی قیام گاہ کے لیے عربی میں مستعمل ہے، وہ رباط ہے، یہ عراق میں زیادہ رائج ہے۔ رباط میں سرائے کا مفہوم ہے۔ صوفیہ کے پاس خدام و مریدین بھی رہتے تھے اور چوتھی صدی سے نویں صدی ہجری تک سیر و سیاحت بھی حصولِ علم اور کسبِ کمال کا ضروری وسیلہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اس دور کے بزرگوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کثرت سے اس کی مثالیں پائیں گے کہ اُنھوں نے وسیع تر علاقوں کی سیاحت کی اور جہاں کہیں گذر ہوا، وہاں کے درویشوں سے ملاقات کی۔ نویں صدی ہجری کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، مگر بتدریج کم ہوتا گیا۔ چونکہ سیر و سیاحت کرتے ہوئے درویش کسی شہر میں آتے تھے تو وہاں کسی بزرگ کی خانقاہ میں قیام بھی کرتے تھے، اس لیے اس کو رباط کہا گیا۔

ایک اور لفظ ''تکیہ'' ہے۔ اس کی جمع ''تکایا'' اور مفہوم ٹھکانا ہے۔ یہ عموماً قلندروں، مجذوبوں، فرقہ ملامتیہ سے متعلق درویشوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تکیہ عموماً شہر سے باہر کسی باغ میں یا قبرستان میں یا کسی قدیم تاریخی عمارت کے ساتھ، یا سرراہ بھی بنا لیا جاتا تھا۔ اس میں رہنے والا درویش نہ صاحبِ سلسلہ ہے نہ اس کے پاس کثرت سے جہاں گشت درویشوں کی آمد ہے۔ اس لیے اُسے خانقاہ یا رباط نہیں کہا گیا۔ 'تکیہ' میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ یہ ایک طرح کا عارضی ٹھکانا ہے جو عموماً 'جھونپڑا' کچی مٹی کا مکان، یا خیمہ نما جگہ ہوتی ہے۔ مگر بعد میں یہ لفظ ادھر دکن میں بھی وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوتا رہا ہے۔

جب وسطِ ایشیا اور مغربی ایشیاء میں تصوف ایک منظم تحریک بن گیا اور مختلف سلسلے شائع ہو گئے تو مریدوں اور مسترشدوں کی خاصی تعداد خانقاہوں میں رہنے لگی اور ان کو ''جماعتِ خانہ'' کہا گیا۔ یہ لفظ خود دلالت کر رہا ہے کہ ایک بڑی تعداد ہے جو کسی جگہ رہ رہی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ جماعت خانہ خانقاہ کا ایک حصہ بن گیا۔ یعنی خود خانقاہ ایک بڑا ادارہ ہے، جس کے شعبہ جات یا جماعت خانہ ہے، لنگر خانہ ہے، توشہ خانہ ہے اور بعض خانقاہوں میں سماع خانہ بھی ہے۔

یہ تو مختصر تشریح لفظ خانقاہ کی تھی۔ اب ایک بات اور بطور ''دفع دخلِ مقدر'' عرض کرتا

ہوں۔ صوفیہ کے معاندین اور تصوف کے منکرین کہتے ہیں، تصوف کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ عجمیت کی آمیزش سے پیدا ہوا۔ اسلام میں نہ خانقاہ ہے نہ خانقاہی نظام ہے، نہ زاویہ ہے، نہ تکیہ ہے، جماعتِ خانہ ہے نہ رباط ہے۔ تصوف کا اسلام سے تعلق ہے یا نہیں، اس کا جواب تو بارہا دیا جا چکا ہے اور یہ آج کا موضوع بھی نہیں، پھر زیادہ تفصیل چاہتا ہے، اس لیے یہ پہلو نظرانداز کرتے ہوئے میں صرف اِتنا عرض کروں گا کہ ہمارے، آپ کے، سب کے، چھوٹے بڑے تمام صوفیہ اور درویشوں کے بھی آقا و مولیٰ، دین و دنیا کے بادشاہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس اعتبار سے منگولوں کی اصطلاح میں وہ ذاتِ گرامی خانِ اعظم بھی رہے۔ مکہ معظمہ میں دارِ ارقم اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی آنحضرت کا محلِ سکونت تھا۔ اس لیے پہلی خانقاہ مسجدِ نبویؐ ہے۔ جو کچھ صوفیا کی خانقاہوں میں ہوتا رہا ہے، وہی سب کچھ مسجد نبوی میں بھی ہوتا تھا۔ یہ مسجد حضورِ اکرمؐ کا ''زاویہ'' بھی تھی، جہاں آپ رات رات بھر بیدار رہ کر عبادت و ریاضت فرماتے تھے۔ یہ آپ کا ''جماعت خانہ'' بھی تھا۔ بعض ممتاز اصحاب کے گھر بھی مسجد سے متصل تھے اور صحابہ کی ایک جماعت ہمہ وقت مسجد میں حاضر رہتی تھی۔ یہی مسجدِ نبوی رباط بھی تھی کہ باہر سے آنے والے وفود یہیں آپ سے ملاقات کرتے تھے اور بعض کا مسجد ہی میں قیام بھی ہوتا تھا۔ اِسی مسجد میں تکیہ بھی موجود تھا، اصحابِ صفہ سے بڑا قلندر اور کون ہوگا؟ اُنھوں نے مسجد ہی کے ایک چبوترے کو اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ غرض کوئی صفت ایسی نہیں جس کا نمونہ اور مثال مسجد نبویؐ میں نہ ملتی ہو۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسجد نبوی اسلام کی پہلی خانقاہ تھی۔

حضورِ اکرمؐ اس میں مرشدِ اعظم تھے اور آپ کے اصحاب مریدین تھے، جنھوں نے باقاعدہ بیعت کی تھی اور وہ حضور سے دِن رات روحانی استفادہ کر رہے تھے۔ صوفیہ کی خانقاہوں میں ایک مجاہدہ کرنے والے کو جو بات ہفتوں، مہینوں اور برسوں میں حاصل ہوتی ہے، اصحابِ رسول کو وہ مقام تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہ شریف میں صرف کلمہ دہرانے سے ہی مل جاتا ہے۔

اب ذرا یہ غور فرمائیے کہ ''سلسلہ'' کیا ہے؟ سلسلہ کے لغوی معنی ہیں زنجیر۔ مسلسل وہ

چیز ہے جس میں زنجیر کی طرح کڑی سے کڑی جڑی ہوتی ہے۔ کسی زنجیر سے درمیان میں ایک حلقہ غائب کر دیجیے تو اس کا تسلسل ٹوٹ جائے گا، زنجیر کے دو ٹکڑے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے جو دین مکمل ہو کر ہم تک پہنچا ہے، وہ بھی آپ کا ایجاد کردہ نہیں بلکہ حضورؐ سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ زنجیر بھی کہیں تو جا کر ختم ہوتی ہے۔ رسولِ اکرمؐ کی سیرۃ طیبہ کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور انہیں المبتداء والمبعث والمغازی کہا گیا ہے۔ پہلے حصے المبتداء کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوتی ہے اور پھر ہر عہد کے انبیاء اور رسولوں کا بیان ہوتا ہے۔ ایمانِ مفصل میں یہ ہے کہ آمنت باللہ وملائکتہ و کتبہ و رسلہ۔ یعنی ہم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ اور لانفرق بین احد من رسلہ. (البقرۃ: ۲۸۵)، اس کے رسولوں کے درمیان چھوٹے بڑے کا فرق و امتیاز کرنا یا ایک کو ماننا دوسرے کو نہ ماننا یہ ہمارا کام نہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں سے ہمارا اختلاف اس تحریف وتصحیف وتبدل وتغیر کی وجہ سے ہے جو انھوں نے صحائفِ آسمانی اور شریعتِ الٰہی میں کر رکھی ہیں۔ ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہمارے ایمان کی نوعیت یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر ہو کر ایک موسوی یہودی اور ایک عیسائی نصرانی رہتا ہے۔ مگر موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کا انکار کر کے ایک مسلمان، مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ ان پر ایمان لانا از روئے نصِ قرآنی فرض کیا گیا ہے۔

یہ بات قدرے تفصیل سے میں نے یوں عرض کی کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک سلسلۂ نبوت سے وابستہ ہیں، اور اس کی آخری کڑی ہیں۔ جو لوگ آخری کڑی کے منکر ہوں، وہ دوسری کڑی جوڑ کر دِکھا دیں۔ سینکڑوں لوگوں نے پچھلے ۱۵ سو برسوں میں دعوے نبوت و رسالت کیا ہے۔ آج اُن کے نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ وقت کا سیلاب سب کو بہا کر لے گیا۔ جو آج ایسا دعویٰ کر رہے ہیں، وہ بھی خود کو سلسلۂ نبوت سے جوڑ نہیں سکے، صرف دعویٰ ہی دعویٰ

ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ایک سلسلہ ہے اور وہ سلسلۂ نبوت ہے۔ سارے اصحاب آپ کے مرید اور آپ سے تربیت یافتہ تھے۔ اب نبوت ختم ہوگئی تو سلسلۂ ولایت حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے جاری ہوا، وحی کا نزول بند ہوا تو کشف و الہام کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اللہ کہتا ہے کہ اُس سے وہی شفاعت کرسکتا ہے، جسے اللہ اذنِ شفاعت دے دے۔ **من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ.** (البقرۃ: ۲۵۵) اور یہ اذن ہمارے آقا و مولیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر جس نے بیعت کی ہے وہ یقیناً آپ کی شفاعت کا حقدار ہے، اب آج کے زمانے تک ایک شخص کا دوسرے سے بیعت کرنا گویا ایک زنجیر بنا دیتا ہے جس کا ہر حلقہ دوسرے حلقے سے جڑا ہوا ہے۔ میرے پیرومرشد امور دین و دنیا میں میری رہنمائی فرمائیں گے۔ اور قیامت میں اُن کا دامن میرے ہاتھ میں ہوگا اور اُن کا ہاتھ اپنے مرشد کا دامن پکڑے ہوگا۔ اُسی طرح یہ سلسلہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے گا۔ گویا یہ زنجیر ولایت، سلسلۂ نبوت سے جا ملے گی۔

اس تمہید کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ خانقاہی نظام کیا ہے، اس کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں اور یہ کیا کرتی تھی یا یہاں کیا ہوسکتا ہے۔

حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلی قدس سرّہ نے فرمایا کہ خانقاہ کے لیے تین چیزیں درکار ہیں، حال، قال اور مال۔ حال تو یہ ہے کہ پورا سلوک طے کیا ہو اور علومِ باطنی کے رموز و وقائع مرشد کی شخصیت کے آئینے میں نظر آنے لگیں۔ قال سے مراد علومِ ظاہری ہیں یعنی وہ مرشد کتابی علم بھی رکھتا ہو۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول عقائد وغیرہ سے باخبر ہو، تاکہ دوسروں کو غلط راستہ نہ دِکھائے اور مال کی ضرورت اس لیے ہے کہ زیرِ تربیت مریدوں کے ضروری خرچ پورے ہوسکیں۔ محتاجوں اور مسکینوں کی مدد کی جاسکے۔ پھر خود ہی حضرت چراغ دہلویؒ نے فرمایا کہ قال اور مال کی بھی چنداں ضرورت نہیں، البتہ ''حال'' چاہیے۔ یہ بنیادی عنصر ہے جس کے

باطن کی خود تربیت نہیں ہوئی ہے۔ وہ دوسروں کی اصلاح کیا کر سکتا ہے؟ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرّہ کا ایک دوہا پنجابی زبان کا جواہر فریدی میں ہے اور یہ سکھوں کی کتابِ مقدس ''گرنتھ صاحب'' میں بھی آیا ہے، فرماتے ہیں:

ٹوپی لیندے باورے ، دیندے کھرے نلّج
چوہا بل نا مانوے پچھے بندھتے چھج

کسی کو مرید کرتے ہیں تو صوفیہ ''کلاہ'' عطا کرتے ہیں، بابا صاحب فرماتے ہیں کہ جو کسی سے بیعت کر کے کلاہِ ارادت لیتے ہیں وہ باولے ہیں، اور جو دیتے ہیں وہ نرے بے غیرت ہیں۔ کیونکہ یہ ایسا ہی ہے کہ چوہا خود تو بل میں سما نہیں رہا ہے اوپر سے اس نے اپنی دم کے ساتھ چھاج بھی باندھ لی۔ یعنی اپنی ہی نجات و مغفرت یقینی نہیں ہے تو دوسرے کی نجات کا ذمہ کیا لیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بابا صاحب نے اُن عقبی فروش صوفیوں کے لیے کہی ہے جو صاحبِ حال نہیں ہیں اور جنھوں نے تصوف کی دُکان کھول رکھی ہے۔

سب سے پہلے زوال ''قال'' کا ہوتا ہے یعنی علومِ ظاہری سے بے بہرہ رہ گئے۔ نہ قرآن کی خبر ہے، نہ حدیث سے واقفیت ہے، نہ مسائلِ شرعیہ کی سمجھ بوجھ ہے تو ظاہر ہے کہ اخلاق و کردار میں کمزوری آئے گی اور وہ کمزوری باطنی کیفیات پر اثر انداز ہو کر ''حال'' کو پہلے پژمردہ پھر بالکل مردہ کر دے گی۔ تین عناصر میں سے حال اور قال کا تعلق امورِ دینی سے تھا۔ یہ نہ رہ سکے تو دین رخصت ہوا۔ تیسرے عنصر مال کا تعلق دُنیا سے ہے۔ حال اور قال کے جانے کے بعد یہ بڑھ بھی جاتا ہے۔ اس لیے کہ اب اس کا حریف تو کوئی رہا نہیں، حال ہوتا تو وہ ترک و تجرید و تفرید و قناعت و توکل وغیرہ کی طرف دھیان دیتا اور مال کو مبغوض رکھتا۔ اب کوئی احتساب کرنے والا نہیں تو مال ہی مال کر دیتا ہے۔ اسی لیے خانقاہیں بند ہوتی گئیں، درگاہیں کھلتی گئیں، جن میں بعض تو فرضی بھی ہیں۔

خانقاہ اور درگاہ میں کیا فرق ہے؟ اس کو بھی مختصراً عرض کر دوں۔

خانقاہ میں ایک زندہ پیر موجود ہے، جسے کسی مرشد سے باطنی سلوک کی تعلیم ملی ہے۔ اس نے ذکر و شغل سے اپنے قلب کو آئینہ جمالِ الٰہی بنالیا ہے، اُن راہوں کا عرفان حاصل کرلیا ہے، جن پر چل کر حقیقتِ اعلیٰ کو پایا جاسکتا ہے۔ اپنے اخلاق و کردار کو شریعتِ محمدی کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ اب وہ بندگانِ خدا کو فیض پہنچانے اور ان کے باطن کو پاکیزہ بنانے کے لیے خانقاہ کے دروازے کھول کر بیٹھا ہے۔ تشنگانِ معرفت جویائے حقیقت اور طالبانِ معرفت آ رہے ہیں۔ اُن کے ذوق اور استعداد اور حوصلے کے مطابق انہیں فیض پہنچا رہا ہے۔

اس خانقاہ میں مساکین و فقراء کی پناہ گاہ بھی ہے، اُن کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں، بیماروں اور دردمندوں کا علاج بھی ہے، درماندہ و بیکس انسانوں پر شفقت و رافت بھی ہے۔ اہلِ احتیاج کی حاجتیں پوری کی جا رہی ہیں۔ ایک طرف لنگر خانہ کھلا ہوا ہے تو دوسرے گوشے میں مسند درس بھی بچھی ہوئی ہے اور کتاب پڑھائی جا رہی ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء جو اجودھن گئے اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمہ کی خانقاہ میں رہے تو اُن سے ابوشکور سالمی کی کتاب ''التمہید بیان التوحید'' پوری پڑھی۔ بابا صاحب نے انہیں آخر میں اس کا اجازت نامہ لکھ کر دیا۔ جو سیر الاولیاء میں موجود ہے اور اس میں یہ تاکید کی کہ وہ بھی اپنے مریدوں کو اس کتاب کا درس دیں اور اس کا اہتمام کریں کہ کتاب کے متن میں کسی طرح کی تصحیف و تحریف نہ ہو۔ التمہید اُصول عقائد کی بہترین کتاب ہے۔ یہ عربی میں ہے اور ۱۲۲۹ھ میں ایک بار مطبع غریب حصار سے شائع بھی ہوئی تھی، اب بہت کمیاب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے چشتی بزرگوں کے عقائد کیا تھے۔ بعد میں بے علم عقیدت مندوں نے اپنے عقائد کو ان بزرگوں سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔

یہ بات حتمی طور پر ثابت ہے کہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے عقائد وہی تھے جن کی تشریح ابوشکور سالمی کی کتاب میں ملتی ہے۔ اِن عقائد پر کاربند رہنے اور اپنے مریدوں کو تلقین کرنے کی بھی اُنہوں نے اپنے خلیفہ و جانشین حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کو تاکید کی۔ تصوف میں ارادت کا نام ''اتحاد مطلب'' اور اتباعِ کامل کے سوا کچھ نہیں، تو وہی عقائد یقیناً

حضرت محبوب الٰہیؒ کے بھی تھے اور وہی حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے عقائد بھی رہے ہوں گے جو اُن کی تصانیف سے ثابت ہیں۔ اور ''سلسلہ'' اِسی کا نام ہے اگر کسی مرید کا عقیدہ اپنے پیر ومرشد سے منحرف ہوگیا تو وہ مرید رہتا ہی نہیں، بقول مولانا روم ''مَرید'' ہو جاتا ہے۔ اس لیے ان بزرگوں کی تصانیف میں اگر کوئی بات اجنبی نظر آئے تو اُسے فوراً اُن کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے۔ پوری تحقیق اور چھان پھٹک کی ضرورت ہے۔ کتابوں میں اضافہ اور الحاق ہمیشہ ہوا ہے۔ کتابوں کیا، احادیثِ نبویؐ میں ہوا ہے۔ حدیث کے مقابلے میں ملفوظات وتصانیفِ صوفیہ تو بہرحال کمتر درجے کی چیز ہیں۔

یہ ذرا سی گفتگو عدالتی اصطلاح میں بے جوڑ (Irrelevant) ہوگئی۔ مگر کچھ ضرورت پوری ہو سکے تو تھوڑا سا بہک جانے میں بھی مضائقہ نہیں۔

خانقاہ میں سب سے بڑا اور بنیادی کام تعلیم وتربیت کا تھا۔ تعلیم علومِ ظاہری کی، علومِ باطنی اور علومِ نافعہ کی، باطنی تعلیم میں (Practicals) پر زیادہ زور تھا، کہ تصوف ریسرچ کرنے کی چیز نہیں۔ یہ چاہتا ہے کہ آپ Search کریں۔ ریسرچ کو علمائے ظاہر کے لیے چھوڑ دیں۔

درگاہوں سے یہ سب کیفیات اُٹھ گئیں۔ بقول اقبال

خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی پوری زندگی تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، تزکیہ وتربیت، ارشاد وہدایت میں گزری۔ مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ حضرت بندہ نواز کی تدفین کے بعد اُن کے صاحبزادے حضرت سیّد اصغر حسینیؒ مسندِ درس پر آ کر بیٹھ گئے تھے اور کتاب پڑھانی شروع کر دی تھی۔ صرف اس چھوٹی سی بات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ خانقاہی نظام میں اور بندہ نواز کے طریقِ سلوک میں تعلیم کو کتنی اہمیت حاصل تھی کہ اُسے ایسے وقت بھی ملتوی نہیں کیا گیا۔

یہ تعلیم جو خانقاہ میں ہوتی تھی، اس میں اور دُنیا بھر کے تعلیمی اداروں اور مدارس کی تعلیم وتدریس میں فرق کیا تھا؟ مدارس میں جو علم پڑھایا جاتا ہے وہ علم کے قشور یا چھلکے ہیں، اس

سے یہ ہوتا ہے کہ انسان کی جہالت و بہیمیت ظاہر سے دور ہو جاتی ہے مگر باطن کے گوشوں میں چور بن کر چھپ جاتی ہیں۔ دیکھنے میں وہ عالم ہوتا ہے مگر اُسے ایک ''مستند جاہل'' سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ حقیقتِ اشیاء سے باخبر نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ سیب کی ہزاروں قسموں سے واقف ہوں۔ اس کی ساری نباتیاتی خصوصیات کا بھی علم رکھتے ہوں، یہ بھی جانتے ہوں کہ سیب میں شکر کتنی ہے، لوہا کتنا ہے، وٹامن کون کون سے ہیں، وغیرہ۔ مگر خود کبھی سیب کھایا نہ ہو، تو اس سارے علم کا اعتبار کیا ہے؟

خانقاہی نظام کا علم حق الیقین تک پہنچاتا ہے، حقیقت الحقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہاں علم کے ساتھ عمل بھی ہے۔ علماء جو کچھ جانتے ہیں، صوفیا اس کو عمل میں برت کر دیکھتے ہیں اور دِکھاتے ہیں۔ اس لیے اُن کا تھوڑا علم بھی انھیں مکنونات و اسرار تک پہنچا دیتا ہے۔

مشائخ کا قول ہے کہ علم کے تین درجے ہیں اور اُن کی طرف قرآنِ کریم میں تین نہایت حقیر حشرات الارض کے نام سے لے کر اشارہ کر دیا ہے۔ علماء اسے تفسیر بالرائ کہا کریں مگر اِن لطافتوں کی طرف ایک صوفی کی نگاہ ہی جا سکتی ہے۔ علم کے پہلے درجے کا رمز ایک حقیر، بظاہر ہمارے لیے بے فیض کیڑا عنکبوت یعنی مکڑی ہے جس سے قرآنِ کریم کی ایک سورۃ بھی موسوم ہے۔ یہ کیڑا اپنے لعاب سے ایک جال بناتا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ اپنا رزق حاصل کر سکے۔ دوسرے کیڑے مکوڑے اس میں آ کر پھنس جاتے ہیں اور عنکبوت کی روزی روٹی چلتی رہتی ہے، یہ وہ علم ہے جو روزی کمانے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح لے کر عنکبوتی علم کہا جا سکتا ہے اور قرآن نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ''انّ أوهن البيوت لبيت العنكبوت۔'' (العنکبوت: ۴۱) سب سے بودا اور ناپائیدار گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔ یہی حال عنکبوتی علم رکھنے والوں کا ہوتا ہے۔ جس کا خلاصہ اکبرالہ آبادی نے یوں بیان کر دیا ہے:

کیا کہوں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

ایک ہی مصرعہ میں عنکبوتی علم کی ساری روداد آ گئی۔

علم کا دوسرا درجہ جسے قرآن سے ایک علامت مستعار لے کر بیان کیا جا سکتا ہے، وہ نملی علم ہے۔ نمل کے معنی ہیں چیونٹی، اور اس سے بھی قرآن کی ایک سورۃ موسوم ہے۔ چیونٹی کیا کرتی ہے؟ سخت محنت، دور دور سے ذرّہ ذرّہ غذا جمع کر کے اپنے مسکن میں رکھتی ہے تا کہ برسات میں بھوکی نہ مرے اور وقتِ ضرورت یہ غذا اس کے کام آئے۔ جو لوگ محقق اور ریسرچ اسکالر کہلاتے ہیں، حوالے کی کتابیں لکھتے ہیں، اِدھر اُدھر بکھری ہوئی معلومات کو یکجا کر کے کسی موضوع پر خود کتاب لکھتے ہیں یا دوسرے لکھنے والوں کی مدد کے لیے مواد جمع کر دیتے ہیں۔ اُن کے علم کی مثال مشائخ کے نزدیک چیونٹی کی ہے اور اُن کا علم نملی علم ہے جو وقتِ ضرورت کام آتا ہے کہ آپ کو کسی لفظ کے معنی کی تلاش ہے تو ڈکشنری میں دیکھ لیا۔ کسی کے سوانح حیات معلوم کرنا ہیں تو تذکرہ و سیرۃ کی کتابوں سے مدد مل گئی۔ یہ علم بہر حال عنکبوتی علم سے اچھا ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ اِسی علم میں آ سکتے ہیں۔

علم کا تیسرا اور اعلیٰ درجہ وہ ہے جسے صوفیہ نے ''نحلی علم'' کہا ہے۔ قرآن کریم میں ایک مسودہ النحل بھی ہے۔ نحل شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔ وہ کیا کرتی ہے؟ پھلوں اور پھولوں سے ذرّہ ذرّہ رس چوستی ہے اور اُسے شہد میں تبدیل کر دیتی ہے۔ شہد کو اِتنا پاک اور پاکیزہ رکھتی ہے اگر کوئی شہد کی مکھی کسی گندی جگہ غلطی سے بیٹھ کر آ گئی ہے تو اس کے چھتے میں ایسے مکھیاں بھی دروازے پر پہرہ دیتی ہیں جو وہیں اس کے دو ٹکڑے کر کے پھینک دیتی ہیں۔ یہ ہماری عام گندی مکھی کبھی شہد پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ کتے کے سامنے شہد ڈالیے تو دُور سے سونگھ کر چھوڑ دے گا۔ یہ اس کی پاکی اور نفاست کا قدرتی انتظام ہے۔ قرآنِ کریم نے شہد کی مکھی کے لیے ہی کہا ہے واوحی ربک الی النحل. (النحل: ۶۸) اور اللہ نے شہد کی مکھی پر وحی بھیجی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب نہیں بھیجتا۔ قرآن کی اصطلاح یہ ہے کہ جب زمانہ ماضی و حال و مستقبل تینوں کا احاطہ کرنا ہو تو ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ جیسے کان اللہ علیما حکیما۔ اللہ جاننے والا اور حکمت والا تھا۔ اس کا یہ مفہوم نہیں ہو سکتا کہ اب اللہ علیم و حکیم نہیں

ہے، پہلے کبھی تھا۔

تو شہد کی مکھی پر آج بھی وحی کا نزول ہوتا ہے۔ اب وہ کیا وحی ہے؟ یہ اللہ جانے یا شہد کی مکھی جانے۔ پھر شہد کے لیے قرآنِ کریم نے صاف الفاظ میں فرمایا **و فیه شفاء للناس**۔ اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ **للناس** کہہ کر ساری بشریت کا احاطہ کرلیا گیا۔

صوفیہ کے نزدیک علم کا اعلیٰ ترین درجہ ''نخلی علم'' ہے جو علومِ ظاہری کو عرفان کے شہد میں بدل دیتا ہے۔ پھر وہ عرفان ایسا پاک اور پاکیزہ ہوتا ہے کہ جہلا اور کورمغز اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔ جیسے کتا شہد نہیں کھا سکتا۔ اور اس عرفان میں روحانی صلاح و فلاح بھی ہے جیسے شہد میں **شفاء للناس** ہے اور اس علم کے حاصل کرنے پر کشف و الہام کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ اس لیے کہ انسانوں پر وحی کا نزول بند ہو چکا ہے اور اُن کے لیے اب الہام ہی نائب وحی ہے۔

خانقاہی نظام میں دی جانے والی تعلیم یہی نخلی علم پیدا کرتی تھی۔ اِسی کی لطافت، نفاست، دقیقہ شناسی اور نکتہ رسی کا کچھ اندازہ ان بزرگوں کے ملفوظات کا گہرا مطالعہ کرنے سے ہوسکتا ہے۔ یہ خانقاہی علم عملی تربیت کے شانہ بشانہ چلتا تھا۔ تربیت کے فوائد حاصل کرنے کے لیے بنیادی ضرورت ادب کی ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں: **التصوف کله ادب**۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مبعوث کرنے سے پہلے اللہ نے زیورِ ادب سے آراستہ کیا تھا۔ حدیثِ نبویؐ ہے: **ادبنی ربی فاحسن تادیبی**۔ مجھے میرے رب نے ادب سکھایا اور بہترین ادب سکھایا۔ اس تادیب کے بعد ہی قرآنِ کریم یہ کہہ سکتا تھا کہ **انک لعلی خلق عظیم**. (القلم: ۴) اے نبی آپ یقیناً عظیم تر اخلاق کے حامل ہیں۔ اور جب کوئی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اخلاقِ نبویؐ کے بارے میں سوال کرتا ہے تو وہ فرماتی ہیں: **خلقه القرآن**۔ اُن کا اخلاق قرآن ہے۔ یعنی جو کچھ قرآن میں ہے، وہ سب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ اور اخلاق و کردار میں موجود تھا۔

خانقاہی نظامِ تربیت یہ کہتا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن خود اس کا نفس ہے۔

بقول سعدی:

مردم از دست غیر می نالند
سعدی از دست خویشتن فریاد

یہ نفس خواہشوں کا منبع ہے اور اس کا مغلوب کرنا ہی سب سے زیادہ دشوار ہے۔ ذوقؔ دہلوی کے لفظوں میں:

ننگ و اژدھا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا

مشائخ نفس کو مارتے ہیں اور قلب کو زندہ کرتے ہیں۔ تصوف نے جتنا شخصی تجزیے پر زور دیا ہے۔ عہدِ حاضر کا علمِ نفسیات ابھی اس کے مبادیات کو بھی نہیں پہنچ سکا ہے۔ صوفیہ ہمارے اعمال کے اسرار تک پہنچ جاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پہلا درجہ خطرے کا ہے۔ خطرہ وہ خیالات ہیں جو ہمہ وقت ذہنِ انسانی میں گردش رہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کے قلب میں یہ خطرہ گزرتا ہے کہ وہ چوری کرے، اب وہ چوری کرنے کے ارادے سے کسی گھر کا رُخ کرتا ہے۔ یہ عزیمت یا Determination ہے اور یہ دوسری منزل ہے اور اس اسٹیج تک یہ Cognizable نہیں ہے، جسے تعزیراتِ ہند کی اصطلاح میں ''قابلِ دست اندازیٔ پولیس'' کہا جاتا ہے، نہ اسے ہمارا عرفی قانون پکڑ سکتا ہے، نہ اس سے شریعت تعارض کر سکتی ہے۔ تیسرا مرحلہ وہ آتا ہے جب یہ خطرہ قوت سے فعل میں آ جائے۔ یعنی جو شخص چوری کرنے کی نیت سے نکلا تھا، وہ کسی کا سامان چرا لیتا ہے۔ اب اُسے قانون بھی پکڑے گا، شریعت بھی اس پر حد جاری کرے گی۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ ''گر بہ کشتن روزِ اول''۔ دِل میں ایسا خطرہ بھی کیوں گزرا؟ اس پر ہی گرفت کرتے ہیں۔ خطرات کو دِل سے دور کرنے کے لیے ہی ذکر و شغل تجویز کیا گیا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے ذہن و قلب میں اللہ کے سوا اور کسی کا گزر ہی نہ ہو۔ جسے مراقبہ کہتے ہیں وہ نگرانی اور چوکیداری ہے کہ اپنے نفس و قلب پر ہمہ وقت نظر رکھی جائے۔ کوئی ناپسندیدہ خیال

گھنے نہ پائے۔ جب اپنا قلب ایسے خطرات سے پاک ہو جاتا ہے تو اس کی حالت اس آئینے کی سی ہو جاتی ہے کہ جو چیز سامنے آئے وہ اس میں منعکس ہو جائے۔ صوفیہ کے ملفوظات میں ایسے ہزاروں واقعات مل جائیں گے کہ حاضرینِ مجلس نے کسی بات کو سوچا اور شیخ نے اُسی موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ منکرینِ تصوف کہتے ہیں کہ علمِ غیب اللہ کے سوا کسی کے پاس نہیں، مگر یہ علمِ غیب نہیں ہے۔ کشفِ قلب یا کشفِ خواطر ہے اور اس کی مثال وہی آئینے اور عکس والی ہو سکتی ہے۔ شیخ کا اپنا قلب تو مصفّا و مجلّا ہو چکا ہے، اس میں نہ کینہ ہے نہ کدورت۔ ہر طرح کے زنگار سے پاک ہو چکا ہے۔ اب اس کے سامنے جو بھی کشف شئے آئے گی وہ اس کا عکس آئینہ قلب میں دیکھے گا۔ اِسی سے توجہ باطنی کا فلسفہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ نقشبندی سلوک میں توجہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک کامل نقشبندی شیخ کسی طالب علم کو سامنے بٹھا کر یا وہ غائب ہے تو اس کا تصور کر کے اس کے سارے احوال و مقدمات کو چشمِ باطن سے دیکھ لیتا ہے۔

چشتی سلوک میں سب سے اعلیٰ مقام عشق کا ہے۔ عشق کو صوفیہ نے اور شعراء نے بھی آگ سے تشبیہہ دی ہے۔ جگر مرادآبادی کہتے ہیں:

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجئے
اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اور نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کا شعر ہے:

شائد اِسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اِک آگ سی سینے کے اندر لگی ہوئی

کسی گھر میں آگ لگ جائے تو سب کچھ بھسم کر دیتی ہے۔ انسان کے خانۂ دِل میں بھی شہوات و خواہشاتِ نفسانی، حسد، کینہ، بغض، طمع، غضب، مکر و حیل وغیرہ کاٹھ کباڑ کی طرح بھرے ہوئے ہیں اور اس کے خیالات انہیں میں الجھے رہتے ہیں۔ چشتی صوفیہ آتشِ عشق سے یہ سب خس و خاشاک پھونک دیتے ہیں، خانۂ دِل کو ویرانۂ دِل بنا دیتے ہیں۔

صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد
تا مہر دگر سکے نروید ہرگز

اب اس میں اور کسی کی محبت کا بیج پنپ نہیں سکتا۔

محبت اِک جاذِبہ ہے، اس میں کشش ہے۔ محبّ کا دِل محبوب کی طرف اس طرح کھنچتا ہے جیسے لوہا مقناطیس سے بے اختیار لپٹ جاتا ہے۔ چشتی بزرگ کہتے ہیں کہ اس کائنات کی اساس بھی ''عشق'' ہے۔ کائنات میں اربوں کھربوں ستارے ہیں۔ اِن میں سے بعض سورج سے بھی کئی لاکھ گنا بڑے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو جاذبۂ عشق ہی سے سنبھالے ہوئے ہیں، اگر یہ جاذبہ چند سیکنڈ کے لیے بھی مفقود ہو جائے تو نظامہائے شمسی کے ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم ہو جائیں۔ گویا مشائخ چشت نے قوامِ کائنات کا بھید بھی پا لیا ہے۔ ایک ایسی شخصیت جو عشق کو مدارِ کائنات سمجھتی ہو اور خالقِ کائنات سے عشق کا رابطہ رکھتی ہو، وہ مخلوقِ سے نفرت نہیں کر سکتی۔ اِسی لیے صوفیہ کا مسلک محبت، رواداری، ہم آہنگی، اخوت و مساوات اور انسان دوستی کا مسلک ہے۔

انسان دوستی اسلام کی بھی بنیادی تعلیم ہے۔ اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اُن کے پتلے میں روح پھونکی و نفخت فیه من روحی. (الحجر: ۲۹) اور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ انسان کی تخلیق بھی بہترین اندازے پر کی گئی۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم. (التین: ۴) اُسے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا۔ اذ قال ربک للملائکۃ انی جاعل فی الارض خلیفة. (البقرة: ۳۰) قرآن و حدیث سے ایسے بہت سے شواہد مل سکتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عظمتِ انسان کا جو تصور دیا ہے وہ اور کسی مذہب میں موجود نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اسلام کے بنیادی اُصول میں رواداری بھی شامل ہے۔ مذہب کے اختلاف کا معاملہ یہ ہے کہ قدتبیّن الرُّشد من الغَیّ. (البقرة)

اسلام کہتا ہے کہ نور و ظلمت میں واضح امتیاز کر دیا گیا ہے اور انسان کو اختیارِ تمیزی دیا گیا ہے، وہ جس راستے کو چاہے اختیار کرے، کسی کو کسی خاص عقیدے کی پیروی کے لیے مجبور

نہیں کیا جا سکتا۔ لا اکراہ فی الدین. (البقرۃ: ۲۵۶) دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔

اسلام کی تعلیم کو علماء نے لفظی تشریح کے ساتھ پیش کیا ہے، صوفیہ نے اس کی روح کو سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے ظاہر کا کبھی عوام سے گہرا رابطہ نہیں رہا، وہ صرف اہلِ مدرسہ میں مقبول رہے ہیں۔ مگر صوفیہ نے اپنا رشتہ عوام سے قائم رکھا ہے۔ اُن کے دُکھ درد کو، مسائل اور وسائل کو سمجھا ہے۔ اِسی لیے پچھلی صدیوں میں دو بادشاہتیں متوازی چلتی رہی ہیں۔ کائنات روح اور مادے کا مرکب درد کو، مسائل اور وسائل کو سمجھا ہے۔ اِسی لیے پچھلی صدیوں میں دو بادشاہتیں متوازی چلتی رہی ہیں۔ کائنات روح اور مادے کا مرکب ہے، انسان کے بھی یہی دو پہلو ہیں جسم اور روح۔ بادشاہ زمین فتح کرتے ہیں، مادّی وسائل پر قبضہ و اقتدار حاصل کرتے ہیں۔ زر و جواہر کے خزانے جمع کرتے ہیں، یہ سب مادّی اشیاء ہیں۔ صوفیہ اقلیم روحانی کے بادشاہ ہیں۔ ان کا سکّہ دِلوں پر جمتا ہے، اُن کی حکومت قلب و روح پر ہوتی ہے۔ اِسی لیے درویشوں کو بھی ''شاہ'' لکھا جاتا ہے۔ ان کی شاہی مادّی بادشاہی سے زیادہ پائیدار اور حقیقی ہوتی ہے۔ دیکھ لیجئے کہ اس علاقے میں ہی چھ سو سال میں کتنی حکومتیں آ کر چلی گئیں، کیسے کیسے دبدبے والے حکمراں ہوئے۔ آج وہ منوں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور کوئی اُن کا نام بتانے والا بھی نہیں، مگر چھ سو سال سے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ کی روحانی حکومت اِسی جاہ و جلال کے ساتھ باقی ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت در فشان است
مئے و میخانہ با مہر و نسان است

اور انشاء اللہ اِسی طرح یہ پھریرا لہراتا رہے گا، مادّی بادشاہتوں کا تمسخر اُڑاتا رہے گا۔

لیکن اب ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ مستقبل کی طرف دیکھنا ہے۔ ڈھائی سو سال سے مسلمان منزلِ زوال سے گزر رہا ہے۔ ہر میدان میں انحطاط Degeneration ہے۔ اب کوئی غزالیؒ، کوئی ہجویریؒ، کوئی گنج شکرؒ، کوئی محبوبِ الٰہیؒ، کوئی چراغ دہلویؒ اور کوئی بندہ نواز گیسو درازؒ جیسی شخصیت نکل کر سامنے نہیں آئی۔ اس لیے مدارس ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے۔ تعلیم کا

رشتہ تربیت سے توڑ دیا گیا۔ اخلاقیات کی کتابوں کو درس سے خارج کر دیا گیا۔ فرضی مبہم غیر مفید اور غیر تاریخی داستانیں بچوں کو پڑھائی جانے لگیں، خانقاہیں بند ہو گئیں۔ دین سے واقفیت کا پارہ صفر کے درجے پر میں آ گیا۔ ''موئے پر سو دُرّے'' یہ ہوئے کہ خود علمائے ظاہر نے عقائد میں کھنڈت ڈال دی اور اپنے عقائد کو اسلاف سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ذہنی پراگندگی اور انتشار پیدا ہونے لگا۔ آج جو حالات ہیں، اُن سے کوئی بھی ذہین اور دور اندیش انسان مستقبل کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی ادارہ اسلامی تعلیمات کی حرمت اور مسلم تہذیب کی شناخت کو باقی رکھ سکتا ہے تو وہ خانقاہ ہی ہو سکتی ہے۔ تاریخِ اسلام میں سب سے بڑا فتنہ تاتار کا حملہ تھا۔ جسے شیخ سعدی نے دیکھا تھا اور پکار اُٹھے تھے۔

آسماں را حق بود گر خوں ببار بر زمیں
برزوال ملک مستعصم امیر المومنین

اس فتنے کا مقابلہ نہ علماء کر سکے، نہ فوجیں کر سکیں، اس پر غلبہ پایا تو اِن گدڑی پوش فقیروں نے جنھوں نے ہلاکو خان کے پوتے کو اسلام کی طرف راغب کر دیا اور پھر لاکھوں منگول اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ تا آنکہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم ہوئی۔ جس کا ایک ضمیمہ سلطنتِ آصفیہ بھی تھی۔ اس کی شان و شوکت ہم میں سے بہتوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوگی۔ غور کیجئے تو یہ سب بھی صوفیہ کا صدقہ تھا۔

ہندوستان میں خانقاہی نظام کا احیاء آج بھی وہی نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

مشائخ صوفیہ نے خلافتِ عباسیہ کے نہایت شاندار زمانے میں، جو تاریخِ اسلام میں سب سے زیادہ خوش حالی کا عہد تھا، فقر و فاقہ، صبر و توکل، زہد و قناعت اور تسلیم و رضا کی زندگی اختیار کر کے اُس عہد کی عیش کوشی، اور فسق و فجور کا مقابلہ کیا تھا، اور ذی ہوش طبقے میں زہد و تقویٰ کا شعور جگایا تھا۔

بعد کی صدیوں میں حاکمانِ وقت کے ظلم و زیادتی کا مقابلہ کیا اور عوام کی پشت پناہی کی، جاگیرداری نظام میں عوام کا براہِ راست رابطہ حاکمانِ وقت سے نہیں ہوتا تھا، وہ دربار میں بار نہیں پا سکتے تھے مگر خانقاہوں کے دروازے اُن پر ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ جو کچھ وہ مادی دُنیا کے حاکموں سے نہ کہہ سکتے تھے وہ فریاد اِن روحانی بادشاہوں تک بے تکلف پہنچا سکتے تھے۔

آج (ہمارے ملک میں) جاگیرداری نظام تو نہیں ہے، مگر فاشٹ قوتیں زور پکڑ رہی ہیں، مختلف مذاہب اور فرقوں کے درمیان نفرت و عداوت پیدا کر رہی ہیں۔ اپنے مفروضات اور واہموں کو تاریخ بنا کر پیش کر رہی ہیں۔ تہذیبی جارحیت کا ذہن بنایا جا رہا ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ آگ کو آگ سے تو نہیں بجھایا جا سکتا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی تمہارے راستے میں کانٹے بچھائے اور جواب میں تم بھی کانٹے بچھا دو تو ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔ اچھا یہ ہے کہ وہ کانٹے بچھائے تو تم پھول برساؤ۔ ایک دِن مخالف خود ہی ہار مان لے گا۔ یہ نسخہ مشکل ضرور ہے اور ذہن اِسے قبول کرنے پر آسانی سے آمادہ بھی نہیں ہوتا مگر خانقاہ کا دیا ہوا نسخہ یہی ہے۔ اگر خانقاہ کا ادارہ (Institution) زندہ ہو جائے تو اس پر عمل کرنا کچھ بھی دشوار نہ ہوگا۔